ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

محمود شیرانی کا تحقیقی طریق کار

حافظ محمود شیرانی مرحوم کے تحقیقی طریق کار کا جائزہ لینے سے قبل یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ ادبی تحقیقی سرگرمیوں کو آسانی کے ساتھ تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی:

۱۔ واقعات کی بازیافت (Fact Finding)

۲۔ ناقدانہ ترجمانی (Critical Interpretation)

۳۔ کامل تحقیق (Complet Research)

یہ گویا تحقیق کے کام کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل میں واقعات کا کھوج لگایا جاتا ہے اور انہیں روایت و درایت کے اصولوں سے پرکھنے کے بعد حقائق کے درجے تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس میں تشکک ایک محقق کا بنیادی اصول ہوتا ہے۔ دوسری منزل میں حقائق کی ناقدانہ توجیہ کرتے ہوئے ان کا باہمی رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔ پھر اس کو ایک اکائی فرض کرتے ہوئے نتائج کا استنباط کیا جاتا ہے۔ اس کارروائی میں یہ ضروری ہے کہ معلوم حقائق کو بنیاد اور متعلقہ شعبے کے اصولوں کو مشعل راہ بنایا جائے۔ محقق کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے مہیا کردہ مواد اور استخراج کردہ نتائج کی بنیادوں پر ہی کوئی فیصلہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی پسند کا فیصلہ پہلے کرلے اور پھر اس کے لیے سہارے تلاش کرتا رہے۔ کامل تحقیق ان دونوں مرحلوں سے آگے کی چیز ہے۔ اس میں کسی علمی

یا ادبی مسئلے کو پیش نظر رکھ کر اس کے درست حل کی تلاش میں سرگرمی دکھائی جاتی ہے ، کوئی غلط فہمی دور کی جاتی ہے یا تہذیب و تاریخ انسانی کا کوئی خلا پر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کارروائی کے دوران میں کسی محقق کو ایک یا زیادہ مفروضے قائم کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ ان میں ایک مفروضہ ایسا ہوگا جو تحقیق کامل کے طریق کار سے گذر کر نظریے کی صورت اختیار کرلے گا۔ ایک خاص میدان میں کسی خاص مسئلے پر غور و غوض کرتے ہوئے تحقیقی مفروضہ وجود میں آتا ہے۔ آج مختلف علوم میں ہم جو نظریات رائج پاتے ہیں وہ سب ابتدا میں مفروضات کی شکل میں نمودار ہوئے تھے۔ مفروضہ وہی بہتر ہوتا ہے جو جملہ کوائف کی صراحت مقابلۃً سادگی اور براہ راست طریقے سے کر سکے۔ علاوہ ازیں اسے اتنا قرین صحت ہونا چاہیے کہ اس کی بنیاد پر لگائے گئے اندازے اور قیاسات درست ثابت ہوں۔

شیرانی صاحب کے ہاں تحقیق کے پہلے دو مرحلوں پر مبنی کام بھی موجود ہے لیکن ان کے تحقیقی سرمائے کا بیشتر حصہ تحقیق کامل کے زمرے میں آتا ہے۔ وہ اپنی تحقیقات میں محض حقائق کی دریافت یا ان کی ناقدانہ توجیہ و تشریح پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایسے علمی و ادبی مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے تاریخ ادب میں پائے جانے والے خلا پر ہوتے ہوں۔ مختلف مسائل پر بحث کے ضمن میں شیرانی کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے زیر نظر مسئلے کا تعارف کراکے اس کی حدود قائم کرتے ہیں۔ اگر زیربحث مسئلہ مشہور و معروف ہو تو اس کی بابت متعلقہ ماہرین اور اپنے پیش رو اہل علم کی آرا بھی درج کر دیتے ہیں۔ بعد ازاں موضوع سے متعلق واقعات و حقائق سپرد قلم کرتے اور

ان کا باہمی ربط و تعلق متعین کرتے ہیں۔ پھر ایک ممکنہ حل یا مفروضہ پیش کرکے واقعات و آرا کی جرح و تعدیل کے ساتھ منطقی استدلال کی مدد سے اس کا ہر ہر پہلو سے احاطہ کرتے ہیں۔ آخر میں اکثر اوقات اس تمام کارروائی کی تلخیص درج کرکے بڑے اعتماد لیکن اعتدال کے ساتھ فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالات کا انداز کسی مقدمے کی عدالتی کارروائی کا سا ہوتا ہے جس میں عنوان، تمہید، دعویٰ، جواب دعویٰ، تنقیحات، شہادتیں، بحث و استدلال اور آخر میں فیصلے کا مرحلہ آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شیرانی صاحب کی اس تمام مصروفیت میں ان کے وسیع مطالعے، عمیق نظر اور منضبط ذہن کے علاوہ لندن میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا بھی حصہ ہے۔

شیرانی صاحب نے تحقیقی نظریات کے موضوع پر کوئی تحریر اپنی یادگار نہیں چھوڑی البتہ ان کے ہاں جدید سائنسی طریق کار عملی صورت میں ملتا ہے۔ ان کے وسیع تحقیقی کام کی روشنی میں ان کے انداز رسائی کا بغور جائزہ لے کر جو اصول و ضوابط بآسانی اخذ کیے جاسکے ہیں وہ مع ضروری لیکن حتی الامکان مختصر مثالوں کے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ تحقیق کا مطلب سچائی کی تلاش ہے جس سے علم انسانی میں اضافہ مطلوب ہے۔ اس کے لیے مستقل جستجو اور مسلسل محنت درکار ہے۔ انسانی تجربات کبھی مکمل نہیں ہوتے؛ چنانچہ علم میں برابر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جوں جوں نئے حقائق دریافت ہوتے چلے جائیں گے، سابقہ معلومات میں ترمیم و تنسیخ کے نتیجے میں ہمارا علم زیادہ معقول، اطمینان بخش اور جامع ہوتا چلا جائے گا۔

۲- حقیقت کی جستجو نہایت دشوار اور صبر آزما لیکن نہایت دلچسپ فریضہ ہے۔ یہ کام کسی لالچ یا خوف کے زیر اثر کماحقہ انجام نہیں دیا جا سکتا :

مرا مدعا ہے فقط علمِ تام نہ حور و قصور و طہور و خیام

۳- تقلیدی انداز نظر علم کے ارتقا کے لیے سم قاتل ہوتا ہے۔ یہاں کوئی چیز آنکھ بند کر کے تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ محقق کو "باایماں قلیل و بعرفاں طویل" ہونا چاہیے۔ انسانی ذہن صدیوں سے اب و جد کے لیے رھوار کا کام دے رہا ہے۔ بڑے سے بڑا اور محترم سے محترم شخص بھی غلطی کرسکتا ہے، اس لیے اس میدان میں "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کا مقولہ غلط ٹھہرتا ہے۔ سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کہنا ہمارے فرائض میں داخل ہے"۔۲

۴- شخصیت پرستی کا ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے کہ علم و فن کے کسی مخصوص میدان میں سر بر آوردہ شخص کو ایسے معاملے میں بھی حکم مان لیاجاتا ہے جس میں اسے کوئی مہارت حاصل نہیں ہوتی۔ شیرانی صاحب ایک مقام پر کہتے ہیں: "لیکن شیخ سعدی کو میں مصلح اخلاق مانتا ہوں نہ مصلح تاریخ"۔۳ تنقید آب حیات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"مگر ایک قصیدہ جو شاہ وقت کی مدح میں ہے، اس عہد کے سب سے مقدس عالم ربّانی کی خدمت میں کیوں بھیجا گیا؟ میری سمجھ سے باہر ہے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز دینی علوم کا سر چشمہ مانے جاتے ہیں لیکن شعر و شاعری خصوصاً ریختے کی شاعری سے انھیں کیا سروکار؟ یہ کام شعر و سخن کے کسی جوہری کے حوالے ہونا چاہیے تھا نہ پیشوائے دین کے"۔۴

۵- اسی طرح کسی شخص سے مخلصانہ تعلقات یا مروت کو عملی تحقیق کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ "دیوان ذوق میں مولانا آزاد کے اضافے" کے زیرعنوان مضمون کی بنیاد شیرانی صاحب نے مولانا آزاد کے ان کاغذات پر رکھی تھی جو انہیں اپنے شاگرد آغا باقر نبیرۂ آزاد سے ملے تھے۔ چنانچہ مضمون کے آغاز میں معذرت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک امر میرے لیے موجب تاسف ہے کہ اس تحقیق و تنقید کے چکر میں آکر مجھ کو حضرت مولانا خصوصاً ان کے پوتے آغا صاحب سے شرمندہ ہونا پڑا۔ مجھ کو پورا پورا احساس ہے کہ میں ان کی مہمان نوازی کا صلہ کھوٹے داموں میں دے رہا ہوں لیکن موقع کی اہمیت کافی عذر خواہ ہے۔ علم پرستی کا لحاظ سب سے اقدم ہے"۔ ۵

۶- مروت کی ایک اور صورت ہے جسے "خاموشی نیم رضا" کے مقولے میں پیش کیا گیا ہے۔ عملی طور پر خاموشی کو مکمل رضامندی کے معنی پہنائے جاتے ہیں تاہم خاموشی کا مطلب اتفاق ہی نہیں اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔ شیرانی صاحب نے ڈاکٹر صادق حسین کے نام ایک خط میں ایک دلچسپ واقعہ قلم بند کیا ہے جس کے آخر میں لکھتے ہیں:

"... میں مسکرا کر خاموش ہوگیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ دروغ گویم بہ روئے تو والا معاملہ تھا"۔ ۶

۷- سریع الاعتقادی کی مانند خوش عقیدگی بھی حقائق کی بازیافت میں سد راہ ثابت ہوتی ہے۔ شیرانی صاحب نے "تنقید شعرالعجم" میں ایک مقام پر کہا ہے۔ "افسوس کہ انہی غلط اصولوں کی پیروی کا نتیجہ ہے کہ آج ہماری تاریخیں غث و سمین اور دروغ و راست

کا مجموعہ بن رہی ہیں۔ ہماری جرح و تعدیل کے پرانے ہتھیار پڑے پڑے رنگ آلود ہوگئے لیکن اس خوش اعتقادی کا رو سیاہ جس نے ہمیں ان کے استعمال سے روک رکھا ہے"۔۷

دیوان معین پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"خواجہ معین الدین کے تفصیلی حالات کے بعد، جن میں خوش اعتمادی کی حد تک صوفیانہ روایات کی تقلید کی ہے، شمس العلماء خواجہ صاحب کے دیوان سے مختلف نمونے مع ترجمہ دیتے ہیں... ہم میں شمس العلماء کا سا جوش اور وجدان نہیں جو ان کے ہر بیان کو صوفیانہ انداز میں آمنّا و صدّقنا کہہ دیں"۔۸

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"لقمان سرخسی کی شعبدہ بازیوں کی نمائش سے جو ہم 'وصلت نامہ' میں پڑھتے ہیں، عطّار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ قصّے صرف لقمان کی قبر کے مجاور کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں"۔۹

۸۔ یہی حالت پیش گوئیوں اور خوابوں کی ہے جن کے اعتبار پر واقعات اخذ کرنا ایک محقق کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری کے مرتبہ 'دیباچۂ قدیم' پر تبصرے کے ضمن میں شیرانی صاحب کہتے ہیں:

"ہمیں چاہیے کہ اس پیشین گوئی کو اس سے زیادہ وقعت نہ دیں جس کی وہ مستحق ہے۔ اس سے کیا فائدہ کہ صوفیوں کے انداز میں ان اشعار سے حقیقی و مجازی معنے پیدا کریں"۔۱۰

تحقیق میں خواب کے مقام کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

"خواب کے متعلق رائے زنی کرنا ایک ادبی نقاد کے منصب میں داخل نہیں کیونکہ اس کے موضوع واقعات ہیں نہ ظنیات"۔۱۱

۹۔ شیرانی صاحب انوکھے اور خلاف عقل واقعے پر آسانی

سے اعتبار نہیں کرتے۔ علامہ شبلی نے "شعرالعجم" میں ایک قصہ نقل کیا تھا۔ اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

"میں اس روایت کے اس غیر معمولی پہلو سے جس میں ایک شخص کا حافظہ اس قدر قوی مان لیا جائے کہ ایک مرتبہ سننے میں کامل قصیدہ از بر کر سکتا ہے، اس کا فرزند دو مرتبہ کی سماعت میں یاد کرلیتا ہے اور ان کا غلام تین مرتبہ کی سماعت میں حفظ سنا سکتا ہے اور حسن اتفاق سے ان بوالعجب ہستیوں کا اجتماع ایک ہی وقت میں اور ایک ہی خاندان میں ہوتا ہے، قطع نظر کرکے اس قدر کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ۔۔۔"۔ ۱۲

۱۰۔ عصبیت و جذباتیت بھی صحت فکر کی راہ میں سنگ گراں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شیرانی صاحب اپنی تحریروں میں مولانا محمد حسین آزاد اور علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی کے مذہبی تعصب کے شاکی نظر آتے ہیں۔

۱۱۔ مبالغہ آمیزی تحقیق کے لیے انتہائی مضر ہے۔ شیرانی صاحب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی تحریروں میں اس سے کامل اجتناب کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس کے قریب پھٹکتے نہیں دیکھ سکتے۔ تنقید شعرالعجم میں ایک موقع پر کہا ہے:

"سچ تو یہ ہے کہ مولانا کی رائے میں واقعیت اس درجے تک موجود ہے جس درجے تک ایک شاندار شاعرانہ مبالغے میں ہوتی ہے"۔ ۱۳

ڈاکٹر خدیجہ فیروزالدین کو ان کے مقالے "خوشحال خان خٹک" پر مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "آپ نے خوشحال کی

کمزوریوں پر پردہ ڈال دیا ہے، اس کے اوصاف کو مبالغے کی حد تک اجاگر کردیا ہے اور مورخ کے فرائض بھول کر آپ نے ایک افسانہ نگار کی حیثیت اختیار کر لی ہے"۔ ۱۴

۱۲۔ تاریخ اور افسانے کے درمیان امتیاز کرنا ایک محقق کا فرض اولین ہے۔ محض شہرت یا رائے عامہ کسی واقعہ کے درست ہونے کا ثبوت نہیں ہوتی۔ ہماری ادبی تاریخ میں یہ خرابی عام رہی ہے۔ شیرانی صاحب نے اس بیماری کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔ ایک موقع پر اس مرض کے تعارف میں کہتے ہیں:

"سب لوگ جانتے ہیں کہ افسانے کی ایک شاخ وہ بھی ہے جس میں تاریخی اشخاص کے گرد فرضی اور خیالی واقعات کی عظیم‌الشان عمارت کھڑی کردی جاتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ہمارے ہاں داستان امیر حمزہ ہے... اب اگر کوئی شخص داستان امیر حمزہ کو صحیح تاریخ سمجھے تو یہ اس کی اپنی سمجھ کا قصور ہے"۔۱۵

ایک اور مقام پر الف لیلہ کی مثال دی ہے:

"وہی مثل ہوئی جیسے کوئی کہے کہ تاریخ میں ہارون رشید کا تذکرہ الف لیلہ کے بیان سے مختلف ہے، اس میں سے کس پر اعتبار کیا جائے؟"۔ ۱۶

۱۳۔ کسی موضوع پر کام کرنے کے لیے مواد فراہم کرنے کی غرض سے محنت اور جستجو ضروری ہے، بصورت دیگر تحقیق کا کام کرنے والا اپنے پیش نظر موضوع سے انصاف نہ کر سکے گا۔ شیرانی صاحب کے نزدیک ادھ کچری کوشش سخت معیوب ہے۔ ڈاکٹر صادق حسین کی ترجمہ کردہ کتاب "ہمارے ہندستانی مسلمان" پر تبصرے کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میری سب سے بڑی تنقید جو اس پر ہے، یہ ہے کہ آپ نے ایسے موضوع کو ہاتھ میں لیا جس کے واسطے آپ بالکل تیار نہ تھے۔ حضرت سید احمد شہید روشن تر از آفتاب ہستی ہیں لیکن آپ نے ان کے تعلق میں سطحی معلومات کا بھی مطالعہ نہ کیا چہ جائیکہ تفصیلی اطلاع دیتے"۔ ۱۷

۱۴۔ ایک محقق کا اولین فرض ہے کہ جو واقعہ بیان کرے اس کی پوری پووی تحقیق اور تفتیش کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرلے اور ہمیشہ کے لیے اسی پر قائم ہوجائے اور اگر آیندہ بھی اس کے اظہار کی ضرورت ہو تو وہی بیان کرے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو رطب و یابس ملا قبول کرلیا۔ نہ اس امر کا خیال رکھا کہ یہ بیان پہلے بیان کے خلاف جاتا ہے یا آیندہ بیان کے مخالف ہوتا ہے"۔ ۱۸

۱۵۔ تحقیق کے ضمن میں معمولی اور جزئی باتوں کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دینا جائز نہیں۔ اگر چھوٹی چھوٹی غلطیاں قابل معافی سمجھ لی جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تحقیق کے کام میں بڑی بڑی غلطیاں بار پا جائیں گی۔ تحقیق کو گورکنی کہا جائے یا اس پر بال کی کھال اتارنے کی پھبتی کسی جائے، ان طعنوں تشنوں سے تحقیق کی منزل نہیں بدل سکتی۔

۱۶۔ تحقیق میں ضروری مواد مہیا کرنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی ضروری بے محل تفصیلات اور حشویات سے اجتناب کرنا ہے۔ شیرانی صاحب شمس العلماء عبدالغنی کی تالیف پر تبصرے کے دوران لکھتے ہیں:

"شمس العلماء اسی قسم کی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں جو ہمارے قدیم مورخین کرتے آئے ہیں کہ وہ لکھنا چاہتے ہیں اپنے عہد کی

تاریخ مگر حضرت آدم سے شروع کرتے ہیں اور اپنے عہد تک پہنچتے پہنچتے ان کا زور قلم ختم اور جوش طبیعت ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی کیفیت اس تالیف کی ہے کہ پروفیسر لکھنے بیٹھے تھے قبل از مغل فارسی ادبیات ہند کی داستان مگر مقدمے میں ایسے مضامین چھیڑ بیٹھے جن سے نفس مضمون کو دور کا بھی تعلق نہیں . . . طفیلی جمع شد چنداں کہ جائے میہماں گم شد"۔ ۱۹

۱۷۔ شیرانی صاحب کے ہاں ایک اور اصول کار فرما نظر آتا ہے، وہ یہ کہ کسی موضوع کو ترتیب کے لحاظ سے پارہ پارہ کرنا نامناسب ہے۔ مقالے کے ضروری اجزاً اپنے اپنے مقام پر رہنے چاہییں اور تقدیم و تاخیر سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

"ہمارے نزدیک کسی موضوع کو اس طرح پارہ پارہ کر کے متفرق طور پر بیان کرنا کتاب کو بے ترتیب بنانے کے علاوہ قاری کی زحمت کا موجب بھی ہے"۔ ۲۰

تنقید آب حیات میں کہا ہے:

"دور اول و دویم و سویم کے شعرأ میں تقدیم و تاخیر واقع ہوئی ہے . . . یہ ترتیب اعتراض سے خالی نہیں"۔ ۲۱

۱۸۔ دوسرے اہل علم کی کاوشوں سے استفادہ کرنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی ضروری اس استفادے کا بالفاظ صریح اعتراف کرنا ہے۔ یہ تحقیق کے طالب علم کا علمی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ شیرانی صاحب اس معاملے میں صداقت کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے مآخذ کا نام لیتے ہیں بلکہ اگر کسی شخص کے ذریعے اس مآخذ تک ان کی رسائی ہوئی ہے تو اس کا نام بھی لیتے ہیں۔ میں اس دور کی صرف دو مثالیں درج کرتا ہوں جب

وہ ٹونک کی عزلت نشینی کے زمانے میں دیوان ذوق مرتبہ آزاد پر مضمون لکھوا رہے تھے :

(ا) "یہ قسط لالہ سری رام کے ایک مختصر بیان پر جو محترمی قاضی عبدالودود صاحب... نے عنایت فرمایا ہے، ختم کرتا ہوں..." - ۲۲

(ب) "آھی کو سبزواری لکھا دیکھ کر مجھے شبہہ ہوا - میں نے اپنی معلومات پر بھروسہ نہ کر کے اپنے محترم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال... کی خدمت میں آھی کی نسبت پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی - ان کا جواب، جس کے لیے میں ان کا بہت ممنون ہوں، یہ آیا کہ..." - ۲۳

ایسی صورت میں شیرانی صاحب حق بجانب ہیں اگر وہ دوسرے اہل علم سے بھی یہ توقع رکھیں کہ وہ جس کتاب سے مستفید ہوں اس کا تذکرہ کریں - "اردو شہ پارے" پر تبصرے میں رقم طراز ہیں :

"دوسرے لوگوں کی محنت اور کاوش دماغی سے فائدہ اٹھانا اور شکریہ درکنار استفادے کے اظہار تک سے گریز کرنا ایک عجیب طریقہ ہے جو نہ مغربی کہا جا سکتا ہے اور نہ مشرقی - 'شہ پارے' کا مصنف سب سے زیادہ مولوی عبدالحق کے مضامین سے خوشہ چینی کر رہا ہے اور اس کے بعد 'اردوے قدیم' سے لیکن اس نے اپنی زلہ ربائی کا اقرار قسم کھانے کو بھی نہیں کیا" - ۲۴

۱۹ - اس اخلاقی تقاضے کا دوسرا پہلو بھی اسی قدر اہمیت کا حامل ہے یعنی بغور دیکھے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دینا چاہیے - ایک محقق کے لیے یہ کہہ دینا کہ فلاں کتاب میری نظر سے نہیں گذری، باعث شرم نہیں بلکہ دیانت کا تقاضا ہے - شیرانی صاحب اپنی تحریروں میں متعدد موقعوں پر ایسا اعتراف کرتے دکھائی دیتے ہیں مثلاً

(ا) "لسان الغیب اگرچہ میری نظر سے نہیں گذری تاہم اس قدر عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ . . ." - ۲۵

(ب) حکیم قدرت اللہ قاسم کی منظوم تصنیفات میں "کرامات پیران پیر کے سوا باقی تالیفات راقم کی نظر سے نہیں گذری ہیں" - ۲۶

(ج) خیاط نام عطار کی بابت کہتے ہیں: "مجھ کو اس مثنوی کے مطالعے کا موقع نہیں ملا" - ۲۷

۲۰ - اقتباسات کی عبارت میں کسی قسم کا حک و اضافہ کرنا بددیانتی اور غیر ذمہ داری کی بات ہے۔ شیرانی صاحب ایک مقام پر اس بارے میں لکھتے ہیں:

"بعض اوقات کسی روایت کی تصدیق یا تردید اور اس کے ضعف و ثقاہت کی شناخت، تاریخی تائید کی غیر حاضری میں، اسی قصے میں نکل آتی ہے، جس سے ایک محقق کو اپنی تحقیقات میں بڑی امداد ملتی ہے۔ اس لیے ہر مورخ اپنا فرض جانتا ہے کہ پرانی روایات کو جوں کا توں، جیسی اس تک پہنچی ہیں، حوالۂ قلم کردے اور اپنی طرف سے کوئی تغیر و تبدل، ترمیم و اضافہ نہ کرے" - ۲۸

۲۱- اسی طرح کسی شعر یا عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے کسی قسم کا فرق ڈالنا یا کمی بیشی کرنا ناواجب بات ہے۔ مولانا شبلی نے ایک مقام پر لکھا تھا کہ سلطان محمود نے غزنی میں ایک عجائب خانہ قائم کیا تھا جس میں دنیا بھر کے نوادر موجود تھے۔ اس بیان کے لیے انہوں نے "تاریخ فرشتہ" کا حوالہ دیا تھا۔ لیکن تاریخ فرشتہ کی محولہ عبارت میں عجائب خانے کا کوئی ذکر نہیں صرف مدرسے کا تذکرہ ہے۔ شیرانی صاحب اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں:

" میں نے جب مولانا کا یہ بیان دیکھا، نہایت محظوظ ہوا کہ یہ عجائب خانے اور چڑیا گھر جن کو ہم مغربی بدعت سمجھا کرتے ہیں، ہمارے اسلاف کی ایجاد نکلے۔ لیکن فرشتہ نے میری تمام خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ خدا جانے قبلہ مولانا نے یہ نکتہ آفرینی کیوں کی ؟"۔ ۲۹

۲۲۔ تحقیق کے دوران میں مختلف مآخذ سے محض اقتباسات فراہم کردینا اور ان سے کوئی مثبت نتیجہ اخذ نہ کرنا بے فائدہ ہے۔ نقل محض کو تحقیق نہیں کہا جاتا۔ شیرانی صاحب متناقض روایات درج کرنے کے بعد اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال حسین کی کتاب پر تبصرے میں گویا ہیں :

"ابو الفرج رونی کی وفات کے متعلق مختلف اقوال دینا۔ ۔ ۔ ہمارے نزدیک تصویر کا نیم رخ دکھانا ہے۔ اگر ہم ڈاکٹر صاحب کی جگہ ہوتے تو اس استدلال کو جہاں انھوں نے ختم کیا ہے وہاں سے یوں شروع کرتے کہ..."۔ ۳۰

دقیقی پر اپنے مضمون کے ضمن میں انھوں نے علامہ قزوینی کے اس خیال کو غلط ثابت کیا ہے۔ کہ دقیقی اور فرخی ایک ہی ممدوح کے مادح یا ہم عصر تھے۔ اس تردید کے ساتھ ہی وہ دقیقی کا زمانہ بھی متعین کرتے ہیں اور بالفاظ صریح کہتے ہیں: "میں ایک مقبول عقیدے کی تردید میں، جو دقیقی کے زمانے کے متعلق یقین کیا جاتا ہے، کسی حد تک کامیاب ہوگیا لیکن اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تا وقتیکہ کوئی اور زمانہ متعین نہ کیا جائے"۔ ۳۱

۲۳۔ اپنی کوتاہی یا نا رسائی کے سبب کسی دوسرے شخص کو مطعون کرنا نامناسب بات ہے۔ مولوی عبدالحق نے "باغ و

بہار" پر اپنے مضمون میں میرامن پر الزام لگایا کہ گو ان کا ماخذ نوطرز مرصع ہے تاہم انہوں نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ شیرانی صاحب نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا:

"یہ ایک اتفاق ہے کہ میرامن نے اپنے دیباچے میں 'نوطرز مرصع' کا بحیثیت ماخذ کوئی ذکر نہیں کیا مگر اپنی تالیف کے سرورق پر صاف الفاظ میں اس کا اظہار کیا ہے... یہی نہیں بلکہ خود ڈاکٹر گلکرسٹ جنہوں نے باغ و بہار کے واسطے فرمائش کی تھی اس اشاعت کے ساتھ اپنے انگریزی دیباچے میں اسی طرح لکھتے ہیں... یہ بیانات میر امن کو ہر طرح کے الزام سے بری کردیتے ہیں" - ۳۲

۴ - دوسرے محققین کی اغلاط کی محض نشان دہی کافی نہیں ہوتی بلکہ اس ضمن میں درست واقعات و حقائق کا انکشاف کرکے انہیں ضبط تحریر میں لانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ شیرانی صاحب" تنقید شعرالعجم کے پیش کلام میں لکھتے ہیں:

"تنقید کے دوران میں میں نے نہ صرف تخریبی پہلو پر نظر رکھی ہے بلکہ حسب اجازت وقت تعمیری کام بھی کیا ہے۔ یوں تو ہر شاعر کے حال میں کم و بیش اس کا پرتو موجود ہے لیکن انوری، نظامی اور عطار کے تذکرے میں بہت نمایاں ہے"۔ ۳۳

یہی حال ڈاکٹر اقبال حسین اور شمس العلماء عبدالغنی کی تالیفات پر ان کے تبصروں کا ہے جن کے تعمیری پہلو کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نذیر احمد رقم طراز ہیں:

"ان کتابوں پر پروفیسر شیرانی کے تبصرے ایک ضخیم کتاب پر بھاری ہیں۔ یہ تبصرے بیش بہا معلومات کے ذخیرے ہیں... ان میں اتنا وافر مواد علمی اور مطبوعہ ماخذوں سے فراہم کر دیا

گیا ہے کہ مغلوں سے قبل کے فارسی ادب کی عمدہ تاریخ مدون ہو سکتی ہے" - ۳۴

۲۵ - جس شخص کی تصنیف و تالیف پر تنقید کی جائے اسے اس کی اطلاع ضرور ہونی چاہیے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی تالیف "خیام" اشاعت کے کئی سال بعد اتفاقیہ شیرانی صاحب کی نظر سے گذری - اس پر انہوں نے لکھا :

"مجھے شکایت ہے کہ سید صاحب نے باوجودیکہ مجھے اپنی قابل قدر تالیف 'خیام' میں ملزم ٹھہرایا ہے لیکن اس کا کوئی نسخہ، میری اطلاع کے واسطے ، حسب رواج زمانہ مجھے نہیں بھیجا اور مجھ کو بےخبر رکھ کر لائق تعزیر قرار دیا۔ میں اس یک طرفہ کاروائی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں - یہ خفیہ تیر اندازی نامناسب ہے :

لاف آں بہتر کہ در میدان سر بازاں ز نیم
شرط دعویٰ نیست تنہا گوی وچوگاں باختن" - ۳۵

۲۶- کسی تالیف کا احتساب کرتے ہوئے اس کے مثبت پہلوؤں کا اعتراف اور قرار واقعی اہمیت کو تسلیم کرنا بھی واجب ہے - علمی اختلاف کو مخالفت برائے مخالفت نہ بنایا جائے - "شعر العجم" اور " آب حیات" پر تنقید کرتے ہوئے شیرانی صاحب نے ان دونوں کتابوں کی عظمت و اہمیت کا دل سے اعتراف کیا ہے -

۲۷- کوئی علمی شعبہ یا صنف فن باقاعدہ ارتقاً کا نتیجہ ہوتا ہے، سحر و افسوں کی مدد سے آن واحد میں وجود پذیر نہیں ہوا کرتا۔ شیرانی صاحب کا کہنا ہے :

"بدقسمتی سے ہمارے ہاں فنون و اشیاً کے آغاز و ابتداً کے متعلق ایک عجیب قسم کا نظریہ قائم کرلیا گیا ہے جو یہ ہے کہ ہر شے اور چیز کا موجد کوئی نہ کوئی شخص ہوا ہے - ہم ایک

چیز کے اتفاقیہ ظہور میں آنے اور تدریجی ارتقاء کے ذریعے سے اس کے کمال پانے کی تمام تحسین ایک ذات واحد کے سر تھوپ دیتے ہیں چنانچہ حضرت آدم صفی اللہ کو سریانی کا اور یعرب ابن قحطان کو عربی کا پہلا شاعر فرض کر لیا گیا ہے اور فارسی میدان میں بہرام گور کے نام پر اول شاعر ہونے کا قرعہ فال ڈالا گیا ہے"۔ ۳۶

۲۸۔ کسی بھی علمی یا تحقیقی کام کرنے والے کے لیے لازم ہے کہ اسے اپنے موضوع سے متعلقہ زبان پر پورا عبور حاصل ہو۔ "خزائن الفتوح" کے ترجمے پر تنقید میں مترجم کی فارسی دانی کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"اس ترجمے میں انہوں نے ہمارے لغات و محاورات اور زبان دانی پر ہر طرح سے کند چھری پھیری ہے اور ہم نے جن روایتی مطالب و معانی پر پرورش پائی ہے وہ سب اس ترجمے میں تقویم پارینہ قرار دے دیے گئے ہیں۔ تنقید ایک تلخ حقیقت ہے۔ ہمیں پروفیسر صاحب کی اس بے باک جسارت پر تعجب آتا ہے کہ وہ اس ترجمے کو، جس کی کوئی سطر استقام سے پاک نہیں، بڑے وثوق اور اطمینان کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں"۔ ۳۷

زبان پر عبور سے یہ مطلب ہے کہ اس کے جملہ ارتقائی مراحل سے بھی گہری واقفیت ہونی چاہیے۔ کسی زبان کے قواعد و محاورات اور ان کے استعمال میں عہد بہ عہد تبدیلیوں پر نظر نہ ہونے کی صورت میں محققین جن فاحش غلطیوں کے مرتکب ہوسکتے ہیں، ان کی مثالوں سے شیرانی صاحب کی تحریریں بھری پڑی ہیں۔ لہذا کسی مثال سے صرف نظر کر کے اس ضمن میں ان کے نظریے پر چند سطور نقل کرتا ہوں:

"ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ امتداد زمانہ اور انقضائے ایام کے ساتھ ساتھ ہر زبان میں تغیرات واقع ہوتے ہیں..... ہر وقت اور ہر عصر کی زبان میں مختلف نوعیت کی خصوصیت مشاہدہ کی جاتی ہے جو اس کو دوسرے ازمنہ کی زبان سے ممیز کرتی ہے .... نئی ضروریات نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات رائج کرتی ہیں اور جس طرح ہم پرانا لباس بدن سے اتار کر پھینک دیتے ہیں اسی طرح مندرس اور پارینہ الفاظ ایک فرسودہ سکے کی طرح ٹکسال سے خارج کر کردیے جاتے ہیں۔ زبان کی نبض شناسی کے لیے لازم ہے کہ ہم اس کے تدریجی تغیر و تبدل کی تاریخ اور ان الفاظ کے حقائق زیست و ممات سے بالکلیہ واقف ہوں" -۳۸

۲۹- اس طرح مختلف اسماء، القاب، خطابات، عہدوں اور اصطلاحات کی لسانی اور تاریخی حیثیت سے آگاہی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے مزاولت نہ ہونے کی صورت محققین دھوکا کھا سکتے ہیں۔ شیرانی صاحب کو اس بارے میں عالمانہ بصیرت حاصل تھی۔ تنقید شعر العجم سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"جب میں نے سلان خاں کا نام پڑھا تو بہت حیران ہوا کہ یہ پٹھانوں کا سا نام غزنوی تاریخ میں کہاں سے نکل آیا۔ دیباچہ بایسنغری میں رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ ارسلان خاں ہے لیکن آخری حصہ پر بھی کھٹکتا رہا کیونکہ ان ایام میں خان کا استعمال صرف شاہان ترک کے نام سے تعلق رکھتا تھا۔ آخر تاریخ میں رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ارسلان خاں اصل میں ارسلان جاذب ہے" - ۳۹

سلطان محمود کے عنصری کو منصب ترخانی عطا کرنے کی روایت پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

"منصب ترخانی کا ذکر ہم غزنوی دور میں نہیں پڑھتے۔ میرا خیال ہے کہ یہ عہدہ سلاطین مغول کے عہد میں رائج ہوا۔ یہ ایک ترکی عہدہ ہے نہ ایرانی"۔۴۰

مثنوی یوسف زلیخا کے فردوسی سے انتساب پر بحث کرتے ہوئے مشہور مستشرق نولدکے کی رائے پر تبصرے کے ضمن میں یہ فقرہ ملتا ہے:

"میں اس نظریے کے خلاف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ الاجل تاج الزماں موفق، جس کا دیباچے میں مذکور ہے اور موفق بہاءالدولہ ایک شخص نہیں ہوسکتے۔ تاج الزماں اور کمال الزماں کی طرز کے القاب پانچویں اور چھٹی صدیِ ہجری میں ملتے ہیں"۔۴۱

تنقید پرتھی راج راسا میں ایک مقام پر کہتے ہیں:

"روشن علی نام کی ترکیب ہرگز قدیم نہیں۔ روشن علی، گلشن علی، دلدار علی وغیرہ طرز کے نام گیارھویں صدی ہجری میں رواج پاتے ہیں اور بخارا کی بجائے ہندوستان میں زیادہ مقبول ہیں"۔۴۲

انسانی اسماء و القاب ہی نہیں، بعض اوقات بادشاہ نئے مفتوحہ شہروں وغیرہ کو جو نئے نام دے دیتے تھے شیرانی صاحب اس پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"علاءالدین خلجی کے مسکوکات پر دھلی اور دیوگیر کے علاوہ ایک دارالضرب دارالاسلام بھی ملتی ہے .... سکہ شناس آج تک یہ معلوم نہ کرسکے کہ اس دارالاسلام سے کونسا شہر مراد ہے بلکہ وہ یہی سمجھتے رہے کہ دھلی ہی کا نام دارالاسلام ہے.... امیر کے بیان بالا کی روشنی میں رنتھنبور کا مسلمانی نام دارالاسلام قرار پاتا ہے"۔۴۳

۳۔ داخلی استشہاد کا اردو میں تعارف شیرانی صاحب کی اولیات میں سے ہے اور آج ہمارے ہاں اس انداز تحقیق کی مقبولیت انہی کی مرہون منت ہے۔ داخلی استشہاد کا عمومی پہلو وہ ہے جسے واقعاتی شہادت کہنا چاہیے۔ کوئی ادیب یا شاعر اپنی تخلیقات میں صریحاً یا اشارۃً ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جو اس کے سوانح حیات، افکارو عقائد یا اس کے دور کے واقعات و میلانات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ شیرانی صاحب ایسی معلومات کو نہایت اہم اور مستند سمجھتے ہیں اور انہیں ثانوی بیانات پر ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً:

"فرخی کے حالات میں یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ سلطان محمود کے دربار میں اس کا تعلق کس زمانے سے ہوا ہے؟ اس غرض کے لیے سب سے صحیح اطلاع اس کے دیوان سے مل سکتی ہے"۔ ۴۴

چنانچہ انہوں نے جن ادبی شخصیتوں کے سوانح و افکار پر قلم اٹھایا، خود انہی کی تصنیفات کو مشعل راہ بنایا۔ فردوسی کے حالات شاہنامے کی مدد سے مرتب کیے اور فردوسی نیز عطار کے عقائد کی جستجو میں ان کی اپنی تصنیفات کو شاہد عادل ٹھہرایا۔ تاہم وہ داخلی واقعاتی شہادت پر آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کرتے بلکہ اس کا ہر پہلو سے جائزہ لے لیتے ہیں۔

داخلی شہادت کا دوسرا یعنی خصوصی پہلو لسانیاتی ہے جسے شیرانی صاحب "شہادت کلام" سے موسوم کرتے ہیں اور ایک ادبی محقق کے لیے اس پر عبور ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ شہادت کلام کا اصل اصول ان کے نزدیک یہ ہے:

"ایک اور اصول ہے جس کا علم ہر محقق کے لیے ضروری ہے۔ انسان جس طرح شکل و صورت، رنگ و لون، اخلاق و طبائع

اور مذاق میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح اظہار خیالات اور ادائے مطالب میں ایک دوسرے سے منفرد ہیں . . . ہر مصنف، خواہ وہ کسی پائے کا کیوں نہ ہو الفاظ ایک خاص ذخیرہ رکھتا ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنے مطالب ادا کرتا ہے"۔ ۴۵

شہادت کلام سے صحت کے ساتھ کام لینے کی خاطر محققین کو اسلوب زبان و بیان کے تین پہلوؤں پر خصوصی نظر رکھنی چاہیے۔ ان میں سے پہلے کو شیرانی صاحب "اسلوب خصوصی" کا نام دیتے ہیں:

"اس ذخیرے میں بعض الفاظ، تراکیب، محاورات، کنایات، تشبیہات، صفات اور استعارات اس قسم کے ہوں گے جو مصنف کے نزدیک زیادہ مقبول اور مطبوع ہوں گے۔ اس بنا پر ان کا استعمال بالارادہ یا بلا ارادہ تحریر میں زیادہ کرے گا کیونکہ وہ اس کے روزمرہ میں داخل ہوچکے ہیں اور یہ سرمایہ اس کی تحریر کا اسلوب خصوصی ہے"۔ ۴۶

دوسرا پہلو "اسالیب ایامی" کا ہے جس کی وہ یوں تشریح کرتے ہیں:

"اگر ایک عہد کے دو انشا پرداز لیے جائیں جو ایک ہی مضمون پر طبع آزمائی کر رہے ہوں تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں ادائے مضمون، انتخاب الفاظ اور اسلوب کلام میں نمایاں تفاوت ہوگا۔ باوجود اس اختلاف کے دونوں معاصروں کی تحریر میں ایک مماثلت قریب بھی مشاہدہ کی جائے گی جو بہ وجہ معاصرت دونوں میں عام ہے کیونکہ ہر چیز پر، خواہ وہ مصنوعات دماغی سے تعلق رکھے یا مصنوعات دستی سے، زمانہ اپنا داغ ضرور چھوڑتا ہے اور وہ خاتم جس کو ایام نے کسی چیز پر ثبت کیا ہے اس

کے نقوش نگیں کو کوئی ہاتھ نہیں مٹا سکتا۔ اس خصوصیت کو "اسالیب ایامی" کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے"۔۴۷

تیسرے پہلو کو وہ "اسالیب مقامی" کا نام دیتے ہیں چنانچہ:

"علیٰ ہذا بعض خصوصیات اس قسم کی ہیں جو کسی خطۂ ملک میں رائج ہیں۔ اگر مصنف اس حصۂ ملک کا باشندہ ہے تو یہ مقامی خصوصیت اس کے کلام میں بھی پائی جائے گی۔۔۔ اس خصوصیت کا نام اسالیب مقامی رکھا جا سکتا ہے"۔۴۸

شیرانی صاحب کو شہادتِ کلام کے موضوع پر جو عمق نظر حاصل ہے اور جس اعتماد کے ساتھ وہ اپنی تحقیقات میں اس ذریعے سے کام لیتے ہیں اس کا اندازہ عبارت ذیل سے ہوتا ہے:

"جس طرح ایک مصور کسی شخص کی تصویر میں اس کی ظاہری شکل و صورت اور خد و خال رنگوں کے ذریعے سے دکھا سکتا ہے اسی طرح ایک منتقد کسی مصنف کے ان تمام خصائص کی، جو اس کی تصنیف کے مخصوص خط و خال ہیں، سراغ رسانی کر سکتا ہے اور اس سے ہم کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ کسی شاعر کا قول ہے:

ہر کجا افتادہ بینی خشت در ویرانۂ
ہست فرد دفتر احوال صاحب خانہ

۔۔۔ جب ایک ماہر آثار قدیمہ کسی شکستہ و ریختہ عمارت پر نظر ڈال کر اس کی عمومی وضع، محرابوں کی ہیئت، گنبدوں کی ساخت، ستونوں کی نقاشی و نقاری، چھت اور دیواروں کی گلکاری، اور نقش و نگاری سے اس کی تعمیر کا صحیح زمانہ قائم کر سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک محقق کسی کتاب کے مقالات، کنایات، محاورات کو دیکھ کر اس کے عہد تصنیف کا سراغ نہ لگا سکے"۔۴۹

شیرانی صاحب نے اس انداز رسائی سے کام لے کر مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے متعدد مصنفین کی تحریروں میں امتیاز قائم کیا اور اس کے نتیجے میں بہت سے پرانے مغالطے رفع کیے۔ تاہم انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس سے بھی آگے قدم بڑھایا ہے اور یہ وہ مقام ہے جسے شہادت کلام کی معراج کہا جا سکتا ہے۔

عام طور کسی ادیب یا شاعر کی کاوش ہائے طبع ربع صدی سے نصف صدی تک کے زمانے پر محیط ہوتی ہیں۔ اسی عرصے میں اس کے زبان و بیان میں بھی ارتقاء کا عمل جاری و ساری رہتا ہے اور اس کے ذخیرۂ الفاظ و محاورات میں ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ایک ہی شخص کے دو مختلف زمانوں کے کلام سے مادۂ فارق دریافت کرنا اصولاً اگرچہ مستند آزمائش اور صحیح طریقہ ہے لیکن وہ کثیر مطالعے کا متقاضی ہے"۔۵

خود انھوں نے اس اصول کا عملی اطلاق داستان بیژن کی باقی شاہنامے پر سبقت زمانی کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے کیا ہے اور جس دقّتِ نظر کا ثبوت دیا ہے وہ ہمارے تحقیقی سرمائے میں بے مثل کہا جا سکتا ہے۔

۳۔ داخلی استشہاد کے بعد شیرانی صاحب خارجی شہادتوں سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب، زندگی یا تاریخ و تہذیب سے الگ تھلگ چیز نہیں ہے بلکہ ایک تہذیبی کل کا جزو ہے۔ اگر شعر و ادب کو اس کے متعلقہ دور کے تہذیبی اور تاریخی پس منظر میں نہ دیکھا جائے تو اس کوتاہی کے نتیجے میں ہم نہ صرف غلطیوں کا شکار ہوں گے بلکہ بہت سے اہم حقائق سے

بے بہرہ رہیں گے۔ چنانچہ ایک جانب تو وہ ادبی مفروضات کو تاریخی صداقتوں کی روشنی میں پرکھتے ہیں اور دوسری طرف ادبیات میں در آنے والی شہادتوں سے تاریخی واقعات کی تصدیق و تائید نیز تہذیبی اقدار کی دریافت کا کام لیتے ہیں۔

۳۲۔ شیرانی کے نزدیک خارجی شہادت کا سب سے وقیع پہلو گو علم تاریخ ہے تاہم انھوں نے بعض دوسرے علوم و فنون سے ادبی وقائع کو پرکھنے کا کام بھی لیا ہے۔ ایک ادبی محقق کے کام میں بہت سے ایسے گوشے ہوتے ہیں جن کا واسطہ معاصر علوم و فنون سے ہوا کرتا ہے۔ شیرانی صاحب اپنی اس بین‌الشعبہ جاتی رسائی میں جن علوم و فنون سے خصوصی امداد لیتے ہیں ان میں مصوری، موسیقی، املا، خطاطی، عروض و قوافی، سکہ شناسی، تاریخ گوئی، کاغذ اور سیاہی کا علم، تہذیب و گلکاری کی شناخت، فن تجلید نیز لباس، زیورات، آلات جنگ اور پھلوں اور پھولوں کی بابت معلومات شامل ہیں۔ ان کے ہاں ان متفرق شعبوں سے استفادے کی شعوری کوشش کارفرما نظر آتی ہے۔

۳۳۔ استشہاد کے ان معروف طریقوں کے علاوہ شیرانی صاحب اپنی تحقیقات میں ایک اور دلچسپ طریقے سے کام لیتے ہیں۔ یوں تو یہ بھی واقعاتی شہادت ہی کی فروع ہے تاہم شیرانی صاحب اس سے اتنا بھرپور کام لیتے ہیں کہ اسے اتفاقی شہادت کے نام سے مستقل حیثیت دی جا سکتی ہے۔ وہ دوسری شہادتیں پیش کرنے کے بعد اتفاقی شہادت کے ہتھیار سے اس چابک دستی سے وار کرتے ہیں کہ قاری کے لیے مؤلف کی رائے سے متفق ہونے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہ جاتا۔ "مظہرالعجائب" کے عطار سے انتساب کو

غلط ثابت کرنے میں انھوں نے دوسری شہادتوں کے بعد ایک سے زائد اتفاقی شہادتیں مہیا کی ہیں۔ مثلاً آخر میں لکھتے ہیں :

"اگر اب بھی اس جعلی عطار کے متعلق شبہہ ہے تو ذیل کے ابیات پر غور کرلیا جائے :

. . . شعر حافظ خوان و یا قاسم نشین
زانکہ ایشانند با ملا" قرین . . .

یہ بھی ایک قسم کی پیشین گوئی ہے۔ حافظ سے مراد خواجہ حافظ شیرازی متوفی ۷۹۲ھ ہیں اور قاسم سے مراد شاہ قاسم انوار ہیں جو ۸۲۵ یا ۸۳۷ھ میں انتقال کرتے ہیں . . ."-۵۱

اسی طرح قصہ چہار درویش کے امیر خسرو سے انتساب کی تردید میں اتفاقی شہادتیں پیش کرتے ہوئے انھوں نے تومان اور اشرفی کے رواج کے علاوہ دورہین کے تذکرے سے بھی استنباط کیا ہے۔ اس قسم کی ایک دل چسپ مثال وہ ہے جو "آب حیات" میں امیر خسرو کے حق پینے والے بیان کی ہوالعجبی دکھانے کے لیے پیش کی گئی ہے۔

۳۴- تحقیق میں جغرافیائی معلومات کی صحت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی تاریخی تفصیلات کی درستی۔ مختلف سلطنتوں اور علاقوں کی حدود، شہروں اور دریاؤں کے محل و قوع نیز جغرافیائی ناموں کی صحت پر خصوصی توجہ دینا ضروری ہے۔ شہرانی صاحب کی تحریروں سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ میں آپ کی توجہ صرف "تنقید پرتھی راج راسا" میں آنے والے عنوانات "سوالک" "کھٹھو" "حصار" کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

۳۵- افزائش علم کے ذرائع میں اسناد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سماجی علوم کی مانند ادبی تحقیق میں بھی براہ راست مشاہدے یا تجربے کے ذریعے علم کی جستجو ممکن نہیں۔ یہاں بڑی حد تک

اسناد و ماٰخذ پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ گویا تحقیق کے طالب علم کے لیے ماٰخذ کی حیثیت خام مال کی ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ آگے قدم نہیں بڑھا سکتا۔ اگر وہ اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر لکھ دے گا تو یہ اس کا بیان بلا جواز اور بے سند گردانا جائے گا۔ شیرانی صاحب ایسا کوئی دعویٰ کبھی نہیں کرتے جس کے لیے ان کے پاس سند موجود نہ ہو۔ یہی توقع وہ دوسروں سے رکھتے ہیں۔ "اردو شہ پارے" میں ڈاکٹر محی الدین قادری کے ایک دعوے کی بابت رقم طراز ہیں:

"مشکل یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس اہم بیان کے لیے کوئی تاریخی حوالہ نہیں دیا۔ بہ حالت موجودہ ہم اس تنہا بیان پر مہر تصدیق لگانے سے انکار کرتے ہیں"۔۵۲

شمس العلماء عبدالغنی نے ابو الفرج رونی سے ایک عروضی تالیف منسوب کی تھی۔ اس بارے میں شیرانی صاحب کا کہنا ہے: "افسوس ہے پروفیسر نے اس بیان کا کوئی حوالہ نہیں دیا جو ہمارے نزدیک غیرموثق ہے"۔۵۳

۳۶۔ ماٰخذ کی جستجو پر زور دینے کے ساتھ ساتھ شیرانی صاحب نے اردو تحقیق کو ماٰخذ کی درجہ بندی کا انتہائی کار آمد سبق بھی سکھایا۔ وہ ہر ایسی ویسی تحریر پر آمنّا و صدّقنا کہنے پر تیار نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک سب سے معتبر شہادت معاصرین کی ہوتی ہے۔ دقیقی کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"جب ایک مورخ کے سامنے دو روایتیں موجود ہیں تو اس کا یہ بھی فرض ہے کم از کم اس امر کی تحقیق کرے کہ ان میں کونسی روایت معتبر ہے۔ ان روایات کے قدیمی رواۃ میرے خیال

میں محمد عوفی اور فردوسی ہیں۔ عوفی ساتویں صدی ہجری کا مصنف ہے جب کہ فردوسی دقیقی کا قریب قریب معاصر ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ فردوسی اس معاملہ خاص میں، عوفی کے مقابلے میں زیادہ صحیح معلومات دے سکتا ہے کیونکہ دقیقی کا ہم عصر اور ہم وطن ہونے کے علاوہ اس کے حالات میں دل چسپی بھی لیتا ہے"۔ ۵۴

۳۷۔ معاصر شہادت کی عدم موجودگی میں، باقی شرائط پر یکساں اترنے کی صورت میں، حوالے کی قدامت اسے زیادہ معتبر ٹھہراتی ہے۔ فردوسی پر ایک بحث کے دوران شیرانی صاحب کہتے ہیں:

"سب کو معلوم ہے کہ نظامی نے ۵۵۰ھ کے قرب و جوار میں اپنی کتاب لکھی ہے اور دیباچہ ۸۲۹ھ میں لکھا گیا۔ اب جو ذرائع معلومات نظامی کو مل سکتے ہیں وہ صاحب دیباچہ یا دولت شاہ کو نہیں مل سکتے۔ اس لیے نظامی کے بیانات کے مقابلے میں دیباچے کی لغویات کو کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی"۔ ۵۵

۳۸۔ کسی بات کی تصدیق اگر مختلف ذرائع سے ہوتی ہو تو اس کے مقابلے میں کسی غریب اور مجہول ماٰخذ کو اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ شیرانی صاحب ڈاکٹر اقبال حسین صاحب کی کتاب پر تبصرے میں لکھتے ہیں:

"اکثر تذکرہ نگاروں نے مسعود کا سال وفات ۵۱۵ھ مانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خلاف جمہور تقی کاشی کی تقلید میں ۵۲۵ھ لکھتے ہیں جس کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں... اس لیے جو لوگ اس کی وفات ۵۱۵ھ میں بیان کرتے ہیں ان کی رائے صحت کے قریب ہے"۔ ۵۶

۳۹۔ اپنے موضوع سے براہ راست تعلق رکھنے والے ذرائع مثلاً تذکروں اور تاریخوں ہی پر اکتفا نہیں کرنی چاہیے کیونکہ

بظاہر غیر متعلق تحریروں مثلاً سفر ناموں، روز نامچوں، مکاتیب اور بیاضوں وغیرہ سے بھی اہم معلومات مل سکتی ہیں جو بالواسطہ ہونے کے سبب قیمتی اور قابل اعتبار ہوتی ہیں۔ اس کی متعدد عملی مثالیں شیرانی کی تحقیقات میں موجود ہیں۔ ایک مشہور ریختے کا امیر خسرو سے انتساب مشکوک گردانتے کی غرض سے انھوں نے جے مل تھار کی بیاض سے سند پیش کی۔ یہ بیاض، جو ۱۰۶۲ تا ۱۰۶۷ھ کی مرتب کردہ ہے، اس ریختے کو کسی جعفر نامی شخص کی ملکیت بتاتی ہے۔

۴۔ مواد کی تلاش میں متعلق اور غیر متعلق مأخذ سے استفادہ کرنے کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ پیش نظر موضوع پر ماضی قریب میں جو اہل علم تحقیق کر چکے ہیں، اس کا مطالعہ کیا جائے۔ بصورت دیگر ایک پامال شدہ زمین بار بار طے کرنے سے وقت ضائع ہوگا۔ سلطان ابراہیم کے سال وفات کے موضوع پر ڈاکٹر اقبال حسین کی بحث پر شیرانی صاحب یوں تبصرہ کرتے ہیں:

"ابراہیم کی وفات کے لیے ہر دو روایت ۴۸۲ھ، ۴۹۲ھ تحریر کرنا اور موخرالذکر سال کی تصدیق کے لیے برٹش میوزیم کے سکوں کی شہادت بیان کرنا ہمارے نزدیک تحصیل حاصل ہے کیونکہ آج ایسا کوئی شخص موجود نہیں جو ابراہیم کی وفات ۴۸۲ھ میں تصور کرتا ہو"۔ ۵۷

اپنے پیش رووں اور معاصرین کے تحقیقی کام پر عدم توجہ سے کوئی محقق اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ شیرانی صاحب شمس العلما کی تالیف پر تنقید میں کہتے ہیں۔

"شمس العلماء اس تمام تحقیقات سے، جو پچھلے چند سالوں میں

اس مضمون پر ہوئی ہے اور ملک میں شائع ہو چکی ہے ، بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں"۔ ۵۷

۴۱۔ شیرانی صاحب اسناد سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں تاہم "سند پرستی" میں مبتلا نہیں ہوتے۔ سند پرستی اس رویے کا نام ہے کہ انسان، سچائی کی جستجو میں بے لاگ عقلی دلائل کے حق سے دست‌بردار ہوکر کسی سند پر ایمان لے آئے۔ گویا قوت استدلال بھی ہمارے علم میں افزائش کا اہم ذریعہ ہے۔ شیرانی نے ہماری ادبی تاریخ میں رائج بہت سے غلط عقائد کو اپنی استدلالی قوت کے بل بوتے پر صحت سے ہم کنار کیا۔

۴۲۔ شیرانی صاحب کے تحقیقی سرمائے کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے ہم پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ قوت استدلال سے کام لینے میں بعض اصولوں پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحقیق میں کوئی جھول باقی نہیں رہتا۔ میں مختصر الفاظ میں ان اصول و قوانین کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:

(ا) اصول دلیل محکم: اس سے مراد یہ ہے کہ ہر واقعے کا کوئی سبب ہوتا ہے جسے ہم عقل کی مدد سے پہچان سکتے ہیں۔

(ب) پیش گوئیاں یک روی: یعنی چند واقعات کا اجتماع ماضی اور حال میں جس باہمی ربط کا حامل رہا ہے آیندہ مجتمع ہونے کی صورت میں انھی روابط کا آئینہ‌دار ہوگا۔ نیز اس کے برعکس۔

(ج) اصول تضاد: یعنی بیک وقت دو متضاد باتیں ہرگز درست نہیں ہوسکتیں۔ اجتماع نقیضین محال ہے۔ فردوسی کے مذہب پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس متضاد عنصر کی موجودگی میں تقیے کا نظریہ ایک لمحے کے لیے بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یا وہ سلطان سے خائف تھا یا نہیں

تھا۔ اگر خائف تھا تو وہ سلطان کو خارجی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور اگر خائف نہیں تھا تو اس کو اپنے مذھب کو چھپانے کی ضرورت ھی نہیں تھی اور نہ سنی عقیدے کے اشعار کہنے کی حاجت"۔۵۹

(د) اصول معروضیت: شیرانی صاحب اپنے تحقیقی کام میں معروضیت پر مبنی رویہ اختیار کرتے ھیں۔ معروضیت کا تقاضا ھے کہ ایک محقق یا نقاد اپنے پیش‌نظر مقدمات و مفروضات کے بارے میں قطعاً غیر جانب‌دار رھے اور اس کے اخذ کردہ نتائج اتنے قطعی ھوں کہ ھر سلیم الطبع شخص ان کی صحت کو محسوس کر سکے۔

(ہ) اصول کفایت: شیرانی صاحب کے استدلال کا ایک لازمی نکتہ اصول کفایت ھے۔ اس سے یہ مراد ھے کہ دیگر کوائف یکساں ھونے کی صورت میں مقابلتاً سادہ تاویل کو باضابطہ اور مبنی بر صحت قرار دینا چاھیے۔ یہ اصول تحقیق میں دور از کار تاویلات سے بچاتا ھے۔

(و) قانون ارتکاز: تحقیقی استدلال میں ایک محقق کو زیر غور مسئلے سے متعلقہ مواد کو غیر متعلقہ مواد سے علیحدہ کر کے اس پر اپنی توجہ مرتکز کرنی چاھیے۔ شیرانی صاحب اس اصول کے تحت ابتدا ھی میں اپنے کام کی حدود کا تعین کر لیتے ھیں اور غیر ضروری مواد کی دخل اندازی سے محفوظ ھوجاتے ھیں۔ ان کے ھاں خلط مبحث کا اندیشہ نہیں رھتا۔ ڈاکٹر رڈولف ھرنلے نے پرتھی راج راسا کی ایک داستان "حسین کتھا" کے مرکزی کردار کی تلاش میں تمام تحقیقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر زمین آسمان کے قلابے ملائے ھیں۔ شیرانی صاحب اس پر بدیں الفاظ تبصرہ کرتے ھیں:

"جس طرح کسی شخص کی چیز گم جاتی ہے اور وہ ہر کس و ناکس پر شبہے کی نظریں دوڑاتا ہے، ڈاکٹر صاحب اس تحقیق کے دوران میں اسی قسم کی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہر حسن و حسین پر، جو غوریوں میں انہیں مل سکا، اپنی مشتبہ نظریں جمادی ہیں، حتیٰ کہ غوریوں کا جد امجد بھی ان کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکا، نہ انھوں نے کسی کے سال و سنین کی پروا کی بلکہ تمام مسلمان مؤرخین کو ہی سہو و نسیان کا متہم بنا دیا"۔ ۶۰

(ز) اصول صحت پیمائش: شیرانی صاحب کب؟ کہاں؟ اور کتنا؟ وغیرہ سوالات کے بارے میں نہایت محتاط رہتے ہیں اور ان کا جواب فراہم کرنے میں پیمائش کی صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں اور دوسروں سے بھی ایسی ہی توقع کرتے ہیں۔

۴۳۔ شیرانی صاحب کی تحقیقات کا مطالعہ کرنے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ مختلف موضوعات پر اپنے تحقیقی نتائج کی درستی کے امتحان کی خاطر بعض منطقی اصولوں کو کسوٹی بناتے ہیں۔ ان میں دو اصول بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ پہلا نظریۂ مطابقت، جس کا مطلب ہے کہ صحیح تحقیقی فیصلے کا کلی صورت حال یا جملہ واقعات سے مطابق ضروری ہے۔ دوسرا نظریہ پیوستگی یعنی عام حالات میں ایک نتیجے کی صحت کا ضامن یہ امر ہے کہ وہ اپنے سے قبل کے اخذ کردہ نتائج کی تصدیق کرے نیز ایسے تمام نتائج خود اس کی تائید کریں۔

۴۴۔ تحقیقی استدلال میں مغالطوں کے دخیل ہونے کا امکان بھی ہوتا ہے جو کسی محقق کو راستے پر ڈال سکتا ہے۔ شیرانی صاحب نہ صرف خود مغالطوں کا شکار نہیں ہوتے بلکہ دیگر

محققین کے کام کا جائزہ لیتے ہوئے ایسے مقامات پر فوراً انگلی رکھ دیتے ہیں جہاں مؤلف کسی مغالطے کا شکار ہوا ہو۔ مغالطے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ میں دو ایک مثالیں درج کرتا ہوں :

(الف) لغوی یا لفظی مغالطے جن میں الفاظ کا ناموزوں اور غیر محتاط استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صادق حسین نے ہنٹر کی کتاب کے ترجمے میں یہ فقرہ لکھا تھا، "سرحد پر باغی کیمپ کے بانی مبانی سید احمد تھے۔" اس پر تبصرے میں شیرانی صاحب لکھتے ہیں :

"یہاں لفظ باغی پر میرا اعتراض ہے۔ سید صاحب کے سرحد پہنچنے کے وقت پنجاب و سرحد میں انگریز کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پھر سید صاحب نے انگریز سے کدھر بغاوت کی۔ سید صاحب کی تحریک ہندوستان میں شروع ہوئی اور ہندوستان میں پروان چڑھی اور یہ سب کچھ انگریز کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ چونکہ تحریک سکھوں کے خلاف تھی اس لیے کمپنی نے دانستہ اغماض کیا اور اپنے علاقے میں اس تحریک کے دبانے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے سید صاحب کو ہنٹر کا "باغی" لکھنا لفظ کا غلط اور جلد بازانہ استعمال ہے" - ۵۸

(ب) ظاہری یا تکلفانہ مغالطے : ان میں ایک محقق اپنے مقدمات کی حدود سے تجاوز کر کے بےبنیاد نتائج اخذ کر لیتا ہے۔ مثلاً ایک پوری جماعت یا اس کی اکثریت کے لیے ایسا دعویٰ کیا جائے جو درحقیقت محض اقلیت یا چند ارکان پر صادق آتا ہو۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے "معیار الاشعار" کو محقق طوسی کی تالیف ماننے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "مشرق و مغرب کے

فضلاً اس نسبت کے قبول کرنے سے تردد کرتے ہیں۔" شیرانی صاحب کا جواب تھا:

"رہو، فہرست نگار مخطوطات فارسی، برٹش میوزیم اور اس کے مقلد، مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی کے دو نام گنا کر سید صاحب نے حکم لگا دیا کہ فضلاً مشرق و مغرب اس نسبت کے قبول کرنے میں تردد کرتے ہیں۔ گویا ان دو ناموں پر مشرق و مغرب کے فضلاً کی فہرست ختم ہوگئی"۔ ۵۹

(ج) تجربی مغالطے: ان کی عمومی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک واقعے کے بعد اتفاقاً دوسرا واقعہ رونما ہونے سے یہ غلط استنباط کرلیا جاتا ہے کہ ان دونوں کے مابین علت و معلول کا تعلق ہے۔ شمس العلماء عبدالغنی نے لکھا تھا کہ سالار مسعود غازی کی لشکر کشی اور شہادت کے نتیجے میں ساتویں صدی ہجری کے اختتام سے قبل ہی اودھ کے علاقے میں فارسی زبان کا دور دورہ ہوگیا۔ شیرانی صاحب اس بات کو تجربی مغالطہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شمس العلماء ایک اور مغالطے میں ہمیں مبتلا کرتے ہیں... یہ بیان بجائے خود درست ہے لیکن سالار مسعود سے اس کا کیا واسطہ... یہ استدلال بالکل بے معنی ہے... وہی کام جو شمس العلماء مدعی ہیں، سالار مسعود کے طفیل میں ہوا، ہم کہتے ہیں درحقیقت وہ کام دہلی میں اسلامی سلطنت کے قیام کی بنا پر ظہور پذیر ہوا"۔ ۶۰

۴۵۔ اسناد و استدلال پر بھرپور انحصار کرتے ہوئے شیرانی صاحب اپنی تحقیقات میں کبھی کبھی ایک قسم کے وجدان سے بھی کام لیتے ہیں۔ یہ شاعرانہ یا صوفیانہ وجدان سے یکسر مختلف چیز ہے۔ اس کا اظہار مختلف انداز میں ہوتا ہے اور عموماً اس جگہ

جہاں ایک مسئلے کے کسی مخصوص پہلو پر ضروری ماٰخذ نایاب ہوتے ہیں اور دلائل عجز کا شکار ہوجاتے ہیں۔ کبھی یہ وجدان استدلال کی ایک اعلیٰ و ارفع شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی اس کا اظہار صورت حال کے مجموعی تقاضوں پر پورا اترنے کی اہلیت (total response to total situation) کے طور پر ہوتا ہے۔ ایک تیسری صورت قیاس علمی یا ماہرانہ رائے کی ہوتی ہے۔

اس وجدانی بصیرت سے شیرانی صاحب محض کسی مجبوری کی صورت میں کام لیتے ہیں۔ ایک تحقیق کو ایسا علمی مسئلہ درپیش ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں معلوم ماٰخذ سے استفادہ کرنے اور قوت استدلال سے کام لینے کے باوجود اس کا کوئی پہلو تشنہ رہ جاتا ہے جس کے نتیجے میں بحث کی روانی اور علت و معلول کے تسلسل میں ایک بدنما خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر شیرانی صاحب راہروانِ علم کی رہنمائی کی غرض سے کوئی قیاسی اشارہ دے دیتے ہیں۔ تنقید پرتھی راج راسا کے ایک حاشیے کے ابتدائی الفاظ دیکھیے:

"ہمیں کوئی تعجب نہ ہوگا اگر راسا، داستان امیر حمزہ کی تقلید میں لکھا گیا ہو۔ اتحادِ مضمون کے علاوہ ان کی داستانوں کی تعداد کا برابر ہونا واقعی حیرت انگیز ہے"۔ ۶۱

بعض اوقات ان کے اس قسم کے قیاسات کی آگے چل کر تائید ہو گئی۔ مثلاً "تنقید شعرالعجم" سپرد قلم کرتے وقت بلبل نامہ عطار کے بعض اشعار کے بارے میں انھوں نے یہ قیاسی فیصلہ کیا:

"مختلف بلبل ناموں کے خاتمے میں اشعار بالا میری نظر سے گزرے ہیں تاہم مجھ کو یقین نہیں آتا کہ یہ عطار کے قلم سے نکلے ہوں"۔ ۶۲

جب تنقید ھذا کتابی صورت میں شائع ھونے لگی تو انھوں نے ان سطور پر حاشیہ ذیل کا اضافہ کیا :

"نظرثانی کرتے وقت معلوم ھوا کہ 'بلبل نامہ' کے اشعار مذکورہ بالا مولانا جامی کے قلم سے نکلے ھیں اور ان کی مثنوی 'تحفۃ الاحرار' (مقالہ ہشتم : در ھند دادن فرزند ارجمند) میں موجود ھیں۔ ضیاءالدین یوسف جامی کے فرزند کا نام ھے۔ انھی کے نام پر 'نصاب ضیائی' مولانا جامی نے تصنیف کیا ھے"۔ ۶۳

شیرانی صاحب کے بعض قیاسات کی تائید ان کی وفات کے بعد ھوئی مثلاً تنقید شعرالعجم میں دو اسدیوں کے نظریے کے بارے میں انھوں نے لکھا :

"یورپین تحقیقات مظہر ھے کہ دو اسدی گذرے ھیں جو ایک دوسرے سے باپ بیٹے کا تعلق رکھتے ھیں . . . یہ بیان مجھ کو بظاھر عجیب و غریب معلوم ھوتا ھے۔ باپ بیٹے میں تخلص کا اشتراک نہایت غیر معمولی ھے۔ لیکن دو زبردست مغربی مشترق ڈاکٹر ایتے اور پروفیسر براؤن اس کے راوی ھیں۔ اس نظریے کی ایک تصدیق نظامی گنجوی کے بیان سے بھی ھوتی ھے"۔ ۶۴

شیرانی صاحب کا یہ شک آگے چل کر درست نکلا جب جدید تحقیقات سے یہ ثابت ھو گیا کہ اسدی ایک ھی تھا اور دو اسدیوں والا نظریہ مغالطے پر مبنی تھا۔

یہ بھی ملحوظ خاطر رھے کہ اس قسم کے ماھرانہ علمی قیاسات کی ضرورت محض تحقیق کامل میں ھوتی ھے۔ شیرانی صاحب کے غالباً ایسے ھی قیاسات کی طرف اشارہ کرتے ھوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا تھا:

"شفیع صاحب کا ایک خاصہ یہ تھا کہ ان کا ذہن حقائق سے زیادہ واقعات کی طرف راغب تھا۔ . . . یہی وجہ ہے کہ ان کے نتائج میں قیاس یا خیال بہت کم دخل انداز ہوتا تھا۔ پروفیسر شیرانی بھی طبعاً اور عملاً مؤرخ ہی تھے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تحقیق تخیل کے اثرات سے مبرا نہ تھی۔ خیال ان کی تحریروں میں دخیل ہو ہی جاتا ہے"۔ ۶۵

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے تمام تحقیقی سرمائے میں تحقیق کامل کی کوئی مثال شاید ڈھونڈھے سے بھی نہ ملے گی۔ ان کا تمام کام واقعات کی بازیافت یا کہیں کہیں ناقدانہ ترجمانی تک محدود ہے۔ اس صورت میں قیاس عملی کی نہ ان کے ہاں ضرورت تھی نہ گنجائش۔

۴۶۔ شیرانی صاحب صحت متن کو بیحد اہمیت دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر پیش نظر متن ہی درست نہ ہو تو اس پر مبنی استخراجِ نتائج کا کام غلط در غلط ہوگا۔ آنکھ بند کر کے ناقص متن پر اعتماد کرلینا تحقیق کے طالب علم کو زیب نہیں دیتا۔ پروفیسر بھگوت سروپ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"پہلا مصرع جس طرح تم نے لکھا ہے مہمل اور بے معنی ہے۔ خدارا متن تو درست لکھا کرو۔ جب متن ہی درست نہ ہو تو انسان کیا کرے۔ . . ضروری یہ ہے کہ صحیح متن کی تلاش کی جائے۔ قلمی نسخے بہم پہنچاؤ"۔ ۶۶

۴۷۔ یہی حالت تحقیق متن کی ہے۔ اس شعبے میں شیرانی صاحب کا کام نہایت وسیع اور وقیع ہے۔ انھوں نے متعدد تصنیفات کو ان کے غیر حقیقی مالکوں کے قبضے سے واگذار کراکے اصل حقداروں

کے حوالے کیا اور بہت سے مصنفین کی تصانیف میں جعلی اضافوں کا سراغ لگایا۔ اس سرگرمی کا اصل اصول بیان کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"مصنفین کے سلسلے میں بعض ایسی ہستیاں نظر آئیں گی جو بغیر کسی صحیح استحقاق کے بزم ادب کے مشاہیر میں شمار ہوکر اصلی اور حقیقی مستحقین کے دوش بدوش کھڑی ہیں... ان میں بعض ایسے بے رحم ہیں جو نہایت بے دردی اور سنگ دلی کے ساتھ غیر لوگوں کے کلام پر قبضۂ مالکانہ جما کر ان کی تمام عمر کی محنت اور جاں کاہی کے نتیجے کو اپنا بنا کر مشہور کر دیتے ہیں۔ ایسے حضرات کو اگر 'ادبی قزاق' کے نام سے موسوم کیا جائے تو موزوں ہوگا... دوسرا گروہ اس گروہ سے کم خطرناک نہیں لیکن نوعیت میں بالکل متضاد ہے... ادبی نقطہ نظر سے ان کا جرم اسی قدر سنگین اور اہم ہے جس قدر سابق الذکر گروہ کا، اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے ان کے جرم کے مختلف مدارج ہیں۔ جس طرح کوئل کوّے کے گھونسلے میں اپنے انڈے چھوڑ آتی ہے، یہ گروہ اپنی تصانیف کو دوسرے کے سر تھوپ دیتا ہے... تیسری صورت مغالطہ ہے جس میں بہ وجہ ہم نامی یا محض اتفاقیہ غلطی کی بنیاد پر ایک شخص کا کلام دوسرے کے سر منڈھ دیا جاتا ہے"۔ ۶۷

۴۸۔ کسی تحقیقی مضمون کی کامیابی کا معیار شیرانی صاحب کے نزدیک کیا ہے؟ ڈاکٹر خدیجہ فیروزالدین کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

"ایک مضمون کو کامیاب سمجھنے کے لیے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کہاں تک نئی اطلاع کا حامل ہے... دوسرے یہ کہ

دادِ تحقیق کہاں تک دی گئی ہے۔ اس سے یہ مطلب ہے کہ اگر کوئی اور شخص اسی مضمون پر قلم اٹھائے تو اس پر کوئی جدید اضافہ نہ کر سکے"۔ ۶۸

۴۹۔ عالم علم و ادب میں کوئی تحقیق حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس لیے ایک محقق کو کبھی تحکمانہ لہجہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ شیرانی صاحب اس معاملے میں حد سے زیادہ محتاط ہیں۔ اس لیے اپنے کئی مضامین کے آخر میں صاحبان علم کو جستجوے مزید کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ ملا دو پیازہ پر اپنے مضمون کے آخر میں کہتے ہیں :

" ان چند امور سے جو تمثیلاً میں نے بیان کیے ہیں، یہ نہ سمجھا جائے کہ فارسی کے تمام ذرائع ملا کے سلسلے میں ختم ہو چکے ہیں۔ اگر تلاش جاری رکھی جائے گی تو مجھے یقین ہے کہ اس کے باقی ماندہ حالات بھی دریافت ہو سکیں گے۔" ۶۹

فارسی تصنیفات سے اردو کے نقروں اور دوہروں کی جمع آوری والے مضمون کا اختتام ان الفاظ پر کرتے ہیں: "یہ مضمون مزید تلاش و تحقیق کا متقاضی ہے . . . اگر باقاعدہ تحقیق و تلاش سے کام لیا جائے تو بے شمار اور ایسے فقرات ہمیں نظر آئیں گے"۔ ۷۰

۵۰۔ اسی طرح وہ کسی معاملے میں عاجلانہ رائے دینے سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ جن موضوعات پر انھوں نے خوب دادِ تحقیق دی ان سے اخذ کردہ نتائج پیش کرنے میں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ معروف ریختے "ز حال مسکین مکن تغافل . . ." کے امیر خسرو سے انتساب کو غلط ثابت کرنے میں انھوں نے جس معیار کی تحقیق کا نمونہ پیش کیا ہے وہ اہل علم

سے مخفی نہیں۔ لیکن اس ساری بحث کے اختتام پر ان محتاط الفاظ میں فیصلہ سناتے ہیں:

"اس طرح اس غزل کا انتساب امیر کی طرف بہت کچھ مجروح ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمیں آخری فیصلہ دینے کے لیے مزید شہادت کا انتظار کرنا چاہیے"۔ ۱ے

دیوان ذوق میں آزاد کے اضافوں پر اپنے مضمون میں وہ باقاعدہ اعلان کرتے ہیں کہ: "میں علمی دلچسپی کے خیال سے ان کے کاغذات کو شایع کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ ان کی اشاعت سے کوئی قابل قبول توجیہ، اس غیر معمولی صورت حال کی بابت، ہمارے ہاتھ آجائے۔ اس صورت میں سب سے پہلے میں اپنی غلطی تسلیم کرنے کے واسطے تیار رہوں گا"۔ ۲ے

۵۱ - یہ محض زبانی جمع خرچ نہیں ہے۔ شیرانی صاحب اپنی تحقیقات میں جو واقعات وغیرہ پیش کرتے ہیں، آئندہ زیادہ محکم شہادتیں مہیا ہونے کی صورت میں، ان میں ترمیم و تنسیخ پر ہمہ وقت آمادہ رہتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۲۸ء میں فرہنگ بحرالفضائل پر مضمون لکھتے وقت انھوں نے کسی واسطے سے رفیع حاجب خیرات کی دستورالافاضل کا سنہ تالیف ۷۴۳ھ (بعہد فیروز شاہ تغلق) بیان کیا تھا۔ اس کے ایک مدت بعد انہیں اس کتاب کا واحد مخطوطہ مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ دیکھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ شمس العلماء عبدالغنی کی تالیف پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے بالفاظ ذیل اس سنہ تالیف کی تصحیح کردی:

"مولانا یہ فرہنگ سنہ ۷۴۳ھ میں، جیسا کہ شعر ذیل سے معلوم ہوتا ہے، تیار کرتے ہیں:

ز هجرت بود هفصد با سہ و چل

مرتب گشتہ دستور الافاضل "۔ ۴۳

ان کے اسی اصول کے پیش نظر قاضی عبدالودود مرحوم نے شیرانی صاحب کی صد سالہ تقریب ولادت کے موقع پر اپنے پیغام میں کہا تھا :

"محمود شیرانی بڑے محقق تھے ۔ میں ان کا بڑا احترام کرتا ہوں ۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا ۔ اور زبردست ناقدانہ صلاحیت تھی ۔ ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ ابتدائی زمانے میں اگر کچھ غلطیاں ان سے ہوئیں تو انہیں چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ خود ہی ان کی تصحیح کی . . . "۔ ۴۴

آخر میں ڈاکٹر نذیر احمد کے ان الفاظ پر میں اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں :

" شیرانی صاحب کی تحقیق راہ ہدایت کی شمع ہے . . . . اس تاریخ ساز شخصیت کے لیے سب سے بڑا خراج تحسین یہی ہے کہ آپ تحقیق کی اس روایت کے حامل بن جائیں، جس کے بنانے میں ان کا زبردست ہاتھ ہے ۔ میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جدید دور کا کوئی محقق یا نقاد ہند و پاکستان میں ایسا نہیں جس کو شیرانی کی طرف سے رہنمائی نہ ملی ہو :

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"۔ ۴۵

——

حواشی

1. Tyrus Hillway: "Introduction to Research", 2nd Ed., Boston, Houghton Mifflin Co., 1964, p.100

۲ - "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ششم، لاهور، ۱۹۷۲ع، ص ۳۴۰-

۳ - "تنقید شعرالعجم"، دهلی، ۱۹۴۲ع ص ۱۰۸-

۴ - "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد سوم، لاهور، ۱۹۶۹ع، ص ۱۳۵-۱۳۶-

۵ - ایضاً، ص ۲۶۳

۶ - "مکاتیب حافظ محمود شیرانی" لاهور، ۱۹۸۱ع، ص ۲۴۹-

۷ - "تنقید شعرالعجم" ص ۶۶-

۸ - "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ششم، ص ۱۲۰-۱۲۳-

۹ - "تنقید شعرالعجم" ص ۳۱۴-

۱۰ - "مقالات شعرالعجم" ص ۳۱۴-

۱۱ - "مقالات شیرانی" ص ۲۱۲-۲۱۳، لاهور، ۱۹۴۸ع-

۱۲ - "تنقید شعرالعجم" ص ۱۹۵-۱۹۶-

۱۳ - ایضاً، ص ۸۲-

۱۴ - "مکاتیب حافظ محمود شیرانی" ص ۴۹-

۱۵ - "تنقید پرتھی راج راسا" دهلی، ۱۹۴۳ع، ص ۶-۸-

۱۶ - "تنقید شعرالعجم" ص ۱۰۷-

۱۷ - "مکاتیب حافظ محمود شیرانی" ص ۴۴۷-

۱۸ - "تنقید شعرالعجم" ص ۶۲-۶۳-

۱۹ - "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ششم، ص ۳۶-۳۷-

۲۰ - ایضاً، ص ۹۸-

۲۱ - ایضاً، جلد سوم، ص ۹۸ -

۲۲ - ایضاً، ص ۲۵۶ -

۲۳ - ایضاً، ص ۱۵۹-۱۶۰-

۲۴ - ایضاً، جلد اول، لاهور، ۱۹۶۶ع، ص ۳۱۰-

۲۵ - "تنقید شعرالعجم" ص ۳۵۶-

۲۶ - "مقالات شیرانی" ص ۲۹۱-

۲۷ - "تنقید شعرالعجم" ص ۴۲۸ -

۲۸ - ایضاً، ص ۹۱-۹۲-

۲۹ - ایضاً، ص ۵۶ -

۳۰ - "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ششم، ص ۱۲ -

۳۱ - ایضاً، ص ۷۶۸ -

۳۲ - "مقالات شیرانی" ص ۲۶-۲۸ -

۳۳ - "تنقید شعرالعجم" (پیش کلام)-

۳۴ - "فارسی زبان و ادب سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقات" مطبوعہ سہ ماهی "اردو" کراچی، اکتوبر ۱۹۸۰ع

۳۵ - "تنقید شعرالعجم" ص ۵۸۹ -

۳۶ - "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد پنجم، لاهور، ۱۹۷۰ع، ص ۶۸۸-۶۸۹ -

۳۷ - ایضاً "جلد ششم" ص ۳۴۰ -

۳۸ - "فردوسی پر چار مقالے" دهلی، ۱۹۲۲ع، ص ۱۹۲-

۳۹ - "تنقید شعرالعجم" ص ۸۹-۹۰-

۴۰ - ایضاً ص ۱۴۵ -

۴۱ - "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد چہارم، لاهور، ۱۹۶۸ع، ص ۵۰ (حاشیہ) -

۴۲ - "تنقید پرتھی راج راسا" ص ۲۵۰ -

۴۳ - "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ششم، ص ۲۱۷-۲۱۸ -

۴۴ - "تنقید شعرالعجم" ص ۷۲ -

۴۵ - "فردوسی پر چار مقالے" ص ۱۸۲-۱۹۳ -

۴۶ - ایضاً -

۴۷ - ایضاً -

۴۸ - ایضاً -

۴۹ - ایضاً، ص ۱۹۴ -

۵۰ - ایضاً، ص ۱۶-۱۷ -

۵۱ - "تنقید شعرالعجم" ص ۴۶۹ -

۵۲ - "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد اوّل، ص ۳۰۶ -

۵۳ - ایضاً، جلد ششم، ص ۱۰۹ -

۵۴ - "تنقید شعرالعجم" ص ۳۵-۳۶ -

۵۵ - ایضاً، ص ۱۰۳ -

۵۶ - "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ششم، ص ۳۰ -

۵۷ - ایضاً، ص ۱۳ -

۵۸ - ایضاً، ص ۱۵۵ -

۵۹ - "فردوسی پر چار مقالے" ص ۱۳۷-۱۳۸ -

۶۰ - تنقید پر تھی راج راسا" ص ۴۱۵ -

۶۱ - "مکاتیب حافظ محمود شیرانی" ص ۴۱۸ -

۶۲ - "تنقید شعرالعجم" ص ۴۷۰ -

۶۳ - "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ششم : ص ۷۶-۷۷ -

۶۴ - "تنقید پر تھی راج راسا" ص ۶-۷ -

۶۵ - "تنقید شعرالعجم" ص ۳۷۰ -
۶۶ - ایضاً (حاشیہ) -
۶۷ - ایضاً، ص ۱۵۲ -
۶۸ - "خود نوشت" مطبوعہ ماہنامہ "افکار" کراچی، مارچ ۱۹۷۴ء -
۶۹ - "مکاتیب حافظ محمود شیرانی ص ۲۵۸ -
۷۰ - "مقالات شیرانی" ص ۲۰۷ - ۲۱۰ -
۷۱ - "مکاتیب حافظ محمود شیرانی" ص ۲۶۱ -
۷۲ - "مقالات شیرانی" ص ۱۰۳ -
۷۳ - "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد اوّل، ص ۱۵۶ -
۷۴ - ایضاً، جلد دوم لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۹۴ -
۷۵ - ایضاً، جلد سوم، ص ۲۶۴ -
۷۶ - ایضاً، جلد ششم، ص ۱۶۸ -
۷۷ - "حافظ محمود شیرانی" پٹنہ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱ -
۷۸ - "فارسی زبان و ادب سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقات" (محولہ بالا)۔